رؤف پاریکھ*

دکنی ادب کی تفہیم کے مسائل اور دکنی اردو کی لغات

Issues in Understanding Dakani's Literary Texts and Urdu Dictionaries of Dakani

Rauf Pareikh

Abstract: Dakani is a regional variety of Urdu spoken in Deccan, that is, certain parts of south India. With the passage of time, Dakani developed its innate, local peculiarities that make it quite different from Urdu spoken in Northern India and elsewhere. Several Indo-Aryan languages and dialects from North, especially Khari Boli, Haryani, Marathi, Gujarati and some local Dravidian dilaects, have influenced Dakani and its literature. Dakani has not only borrowed vocaulary from these languages and dialects but Dakani's own typtical pronunciation of Urdu words and orthographic deviations have made reading and understanding Dakani texts quite difficult to understand. Since Urdu's earliest literary texts were written in Dakanai, it is of utmost importance to understand these texts. To make undertand these texts easier for scholars and common readers, some dictionaries were compiled.

This article first analyses the reasons that have made understanding Urdu's earliest texts written in Dakani more difficult, for example, words borrowed from other languages, local pronunciation of Urdu words, Urdu words written in different calligarphic style and standard, as well as differnt

*سابق سربراہ، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد و سابق صدرِ شعبہ اُردو، جامعہ کراچی

spelling rules , etc. The article then describes and evaluates some dictionaries of Dakani Urdu, compiled to facilitate the understanding of Dakani texts. It lists the earliest such dictionary written in 1935 and the latest one published in 2008, analyzing their worth according to lexicographical principles.

کلیدی الفاظ: اُردو لغت، زبانوں پر اثرات، فرہنگ، لغت نگاری، دکھنی ادبیات، تفہیمیات، املا

شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو کی ادبی تاریخوں پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شمالی ہند کے اہلِ قلم نے جنوبی ہند کے ادبی کارناموں کو نظر انداز کیا، بلکہ ان کا مذاق اڑایا۔[۱]

اپنے مضمون میں فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ نکات الشعرا میں میر تقی میر ''دکن (اصطلاحاً بشمول گجرات) کی اردو شاعری کے تقریباً ساڑھے تین سو سال کا ذکر بطورِ معذرت یہ کہتے ہوئے نمٹا دیتے ہیں کہ وہاں ایک شاعر بھی ایسا نہیں گزرا جس نے دو مربوط مصرعوں والا کوئی شعر کہا ہو''۔[۲] فاروقی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اردو کی ادبی تاریخ نگاری کا جھکاو دہلی کی طرف اس قدر زیادہ رہا ہے کہ دہلی کے باہر اردو کے کسی ادبی مرکز کے لکھنے والوں کو ہماری ادبی تاریخوں میں ان کا وہ جائز مقام نہیں دیا جاتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کی مثال میں وہ کہتے ہیں کہ:

> ''ولی دکنی، ولی گجراتی کو، جنھوں نے دہلی میں اردو زبان اور شاعری کو اپنی شاعری سے متاثر کیا بلکہ درحقیقت ان ہی کی بدولت اس کا آغاز بھی ہوا، طویل عرصے تک ان کے بنیادی کردار سے محروم رکھا گیا۔ جمیل جالبی نے تو ان کی تاریخِ وفات کو بھی مؤخر کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کی شاعری پر 'دہلی کے جاری رہنے والے اثر' کو کمک پہنچائی جا سکے''۔[۳]

فاروقی صاحب کے مطابق:

> ''محمد حسین آزاد نے دکن کے ایک شاعر کا ایک شعر نقل کیا اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے طنزاً کہا کہ اگر یہ شاعری ہے تو پنجاب نے تو درجنوں شاعر پیدا کر لیے ہیں۔ اس طرح پنجاب کو بھی حاشیے پر ڈال دیا گیا''۔[۴]

جنوبی ہند کا حصہ، اردو ادب میں:

فاروقی صاحب کا شکوہ اس حد تک بجا ہے کہ ہم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ بے شک اردو زبان کی تشکیل شمالی ہند میں ہوئی لیکن اردو ادب کا آغاز جنوبی ہند میں ہوا اور اس کے اولین ادبی نمونے دکن یعنی جنوب ہی میں ملتے ہیں (طالب علموں کی یاد دہانی کے لیے عرض ہے کہ لفظ دکن کے لغوی معنی جنوب کے ہیں اور یہ اُتّر یعنی شمال کی ضد ہے)۔ اردو کی اولین مثنوی کدم راو پدم راو کا شاعر فخر دین نظامی بھی تو دکنی ہی تھا۔ کمال خاں رستمی بیجا پوری کی خاور نامہ اردو کی پہلی رزمیہ مثنوی ہے اور بیجاپور دکن میں ہے یا یوں کہیے کہ تھا، کیونکہ اب دکن نام کی کوئی ریاست باقی نہیں (اردو کے ایک معروف نقاد نے اس کا نام بے جاپور لکھا ہے، لیکن درست تلفظ بیجاپور بیائے معروف ہے)۔[۵] خاور نامہ اردو کی طویل ترین رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں تقریباً چوبیس ہزار اشعار ہیں۔[۶] اردو ادب کے اولین گہوارے یعنی سرزمینِ دکن و گجرات نے ہمیں ولی دکنی جیسا شاعر بھی دیا جس نے شمالی ہند کے اردو ادب کی روایات میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ یہ ضرور ہے کہ جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے اردو کے اہل قلم کی کاوشوں کا اعتراف کرنے اور ان پر مزید تحقیقی و تنقیدی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

جنوبی ہند نے ہمیں جو شاعر دیے ان میں محمد قلی قطب شاہ بھی شامل ہیں۔ وہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ قلی قطب شاہ گولکنڈا میں ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۱۲ء میں انتقال کیا (اگرچہ اس کا سالِ وفات بالعموم ۱۶۱۱ء لکھا جاتا ہے)۔[۷] حاکم تھا مگر اردو کا زود گو اور صاحبِ دیوان شاعر بھی تھا۔ تقریباً پچاس ہزار اشعار کہے۔[۸] محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ولی دکنی کو "نظمِ اردو کی نسل کا آدم" کہا ہے۔[۹] لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ ولی سے بہت پہلے قلی قطب شاہ کا اردو دیوان موجود تھا۔ مسعود حسین خان کے مطابق بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۲ء میں سہ ماہی 'اردو' میں ایک مقالے کے ذریعے محمد قلی قطب شاہ کی کلیات کے ایک نسخے کا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب نے قلی قطب شاہ کے دیوان کے جس مخطوطے پر کام کیا تھا وہ کتب خانہ آصفیہ کا مخزونہ تھا۔ افسوس کہ یہ مخطوطہ غائب ہو گیا۔[۱۰] سالار جنگ میوزیم کے نسخہ ہائے قدیم و جدید کی بنیاد پر سید محی الدین قادری زور نے قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب کیا۔[۱۱] بعد ازاں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی قلی قطب شاہ کے دیوان کی تدوین کی اور یہ بھی شائع ہو چکا ہے۔[۱۲]

دکنی اردو پر دیگر زبانوں کے اثرات:

عرض یہ کرنا تھا کہ قلی قطب شاہ کے دیوان کی دکن کے دو مستند و معتبر محققین کے ہاتھوں تدوین کے باوجود اس کی تفہیم اتنی آسان نہیں ہے اور بعض اوقات اس کا کلام قابلِ فہم نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ خود محی الدین

قادری زور نے اعتراف کیا ہے کہ ''افسوس ہے کہ بعض لفظ اور ترکیبیں اب تک مرتب کی سمجھ سے بالا تر ہیں۔''[۱۳] جب دکن کے ایک ماہرِ دکنیات کا یہ اعتراف پڑھتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ ہم جیسے عامی بھلا دکنی ادب کو کیا سمجھیں گے۔ اس کی ایک خاص وجہ قلی قطب شاہ کی زبان ہے۔ اور قلی قطب شاہ ہی کیا، دکنی اردو کے اکثر ماہرین نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ دکنی ادب کے متون میں بعض بہت مشکل مقام آتے ہیں۔

دکن کی بعض مقامی زبانیں بشمول تلگو (جو قلی قطب شاہ کی مادری زبان تھی) دراصل دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ اردو آریائی زبان ہے جو شمالی ہندوستان سے دکن پہنچی تھی۔ دکنی اردو پر متعدد زبانوں بشمول مرہٹی کا بھی اثر ہے اور سنسکرت کا بھی (مرہٹی اور سنسکرت البتہ آریائی زبانیں ہیں)۔ مختلف زبانوں کے یہ اثرات دکنی اردو میں آکر عجب مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ پھر یہ اردو جو قلی قطب شاہ نے لکھی ہے تقریباً چار سو سال پرانی ہے۔ اس کا املا قدیم بھی ہے اور بسا اوقات بالکل مختلف بھی، کیونکہ یہ کسی لفظ کے مقامی دکنی تلفظ کو ظاہر کرتا ہے۔ جب یہ مقامی دکنی تلفظ اردو کے قدیم املا میں لکھا جاتا ہے تو عجب گل کھلاتا ہے۔ قلی قطب شاہ کے ہاں علامتِ فاعل (نے) کا استعمال بالعموم نہیں ہے۔ اسما کی جمع دکن کے مقامی اصول کے مطابق 'اں' کے اضافے سے بھی بنائی جاتی ہے (یعنی مثلاً رات کی جمع راتاں اور بات کی جمع باتاں وغیرہ) اور اس کی بعض صوتیاتی خصوصیات ہیں۔[۱۴] اس کے علاوہ ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ قدیم ادب، خواہ وہ شمالی ہند کا ہو یا جنوبی ہند کا، بالعموم اعراب، رموزِ اوقاف اور علامات کے التزام کے بغیر چھاپا گیا ہے جس کی وجہ سے غلط خوانی کے امکانات ہمیشہ رہتے ہیں۔[۱۵]

سیدہ جعفر کا خیال ہے کہ قلی قطب شاہ کی زبان پر برج بھاشا کا اثر ہے۔[۱۶] مسعود حسین خان یہ خیال پہلے ہی ظاہر کر چکے تھے کہ شمالی ہند کی زبان جب دکن پہنچی ہو گی تو ممکن ہے کہ کوئی ایک شمالی بولی جنوب نہ گئی ہو ''بلکہ کئی بولیاں پہنچی ہوں جن کی آمیزش سے بعد کو وجہی اور قلی قطب شاہ کی معیاری دکنی متشکل ہوتی ہے۔''[۱۷]

سیدہ جعفر کے مطابق آگرہ چونکہ ہندوستان کا دارالحکومت رہا تھا لہٰذا وہاں کی زبان یعنی برج کے علاقے کی زبان (جسے برج بھاشا اور گوالیاری بھی کہتے تھے) اردو کی تشکیل میں اثر انداز ہوئی ہو گی، گو بعد میں دارالسلطنت دہلی منتقل ہونے پر کھڑی بولی کے اثرات بڑھتے گئے۔[۱۸] اس عاجز طالب علم کی رائے میں ان کا یہ خیال اس حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا کے بعض الفاظ دکنی میں براہِ راست آگئے ہوں گے ورنہ خود اردو زبان پر برج بھاشا کا اثر بہت کم ہے۔ بلکہ اس ضمن میں شوکت سبزواری تو یہ تک کہتے ہیں کہ اردو کا لسانی سرمایہ برج سے زیادہ پیچیدہ اور بعض صورتوں میں زیادہ قدیم ہے اور وہ برج سے کسی طرح ماخوذ نہیں ہو سکتا۔[۱۹] جبکہ مسعود حسین خان

کہتے ہیں کہ ''مرہٹی اور گجراتی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی کے تمام غریب الفاظ کی توجیہ نواحِ دہلی کی تین بولیوں (ہریانی، کھڑی اور برج) سے کی جاسکتی ہے''۔[۲۰]

ایک دکنی لغت ''دکھنی لغات'' کے نام سے ہے (اس کا ذکر آگے آرہا ہے)۔اس کے مولف سید ابو تراب خطائی ضامن نے اپنے مقدمے میں دکنی زبان وادب کے مختلف ادوار کے موضوع پر بحث کی ہے نیز دکنی زبان کی خصوصیات بتائی ہیں۔وہ بھی قابلِ غور ہیں۔لکھتے ہیں:

> ''دکھنی زبان کا لسانی اور فنی تجزیہ کرتے ہوئے ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کا روزمرہ اور محاورہ اردو سے بہت کچھ مختلف ہے۔اس میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ ایسے مستعمل ہیں جو اردو میں رائج نہیں ہیں۔ان کے علاوہ دکھنی کے کثیر تعداد [میں] الفاظ [ایسے ہیں جو] اردو زبان کے لیے بالکل غیر ہیں کیونکہ دکھنی کی خصوصیات اگر کسی زبان سے مل سکتی ہیں تو وہ ہریانی، گجراتی یا مراٹھی زبانیں ہیں''۔[۲۱]

ڈاکٹر شری رام شرما نے بھی اپنی کتاب میں اس بات پر زور دیا ہے کہ دکنی پر مرہٹی، گجراتی، میواتی، ہریانی، اودھی اور دیگر زبانوں کے اثرات پڑے ہیں۔ان کے مطابق گجرات سے متصل ہونے کی وجہ سے بیجاپور کی دکنی میں گجراتی کے بعض الفاظ شامل ہوگئے اور گولکنڈے کی دکنی پر راجستھانی بولیوں اور پنجابی کے بھی اثرات ہیں۔[۲۲]

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے دکن میں دیوگری یا دیوگیر (دولت آباد) میں ہوئی جو اس زمانے میں مہاراشٹر کا پایے تخت بھی تھا اور اس کے قریب واقع چھٹھین ایک علمی مرکز تھا۔[۲۳] لیکن یہاں شمالی ہندستان سے محمد بن تغلق وغیرہ کے دور میں ابتدائی طور پر وارد ہونے والوں کی زبان اپنے اصل دھارے (یعنی شمالی ہند کی بولیوں مثلاً کھڑی بولی) سے کٹ گئی تھی۔دیوگیر (دولت آباد) اور آس پاس کے علاقوں کی زبان مرہٹی تھی۔کھڑی بولی کی طرح مرہٹی آریائی زبان ہے اور اسی لیے مرہٹی اور کھڑی بولی (جس سے اردو کا ارتقا ہوا) بعض مشترک خصوصیات کی حامل ہیں۔[۲۴] بعد ازاں شمالی ہند کے جو باشندے دوسرے علاقوں مثلاً گلبرگہ پہنچے وہاں بھی دکنی اردو کی پرورش ہوتی رہی لیکن گلبرگہ، بیجاپور اور گول کنڈے میں کنڑ اور تلگو (جو مقامی دراوڑی زبانیں تھیں) کے الفاظ ادبی دکنی میں جگہ نہیں پاسکے، گو بول چال کی دکنی میں بیجاپور کے آس پاس کنڑ کے اور گول کنڈے کے قرب وجوار میں تلگو کے کئی الفاظ ضرور استعمال ہوتے ہیں۔[۲۵] البتہ بیجاپور میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو وہاں اعلیٰ عہدوں پر مرہٹی بولنے والے فائز ہوئے اور بہت عرصے تک بیجاپور کی سرکاری زبان مرہٹی

رہی اور اس سے دکنی اردو پر مرہٹی کے اثرات قائم رہے۔[۲۶] دراصل مرہٹی اور کھڑی بولی کے آریائی زبان ہونے کی وجہ سے دونوں کے الفاظ ایک دوسرے میں آسانی سے کھپ جاتے تھے۔[۲۷]

دوسری اہم بات اس ضمن میں یہ ہے کہ دکنی مقامی یا علاقائی تلفظ سے محفوظ نہ رہ سکی اور اس میں بھی مختلف علاقوں میں مختلف اثرات نظر آتے ہیں۔ مثلاً اورنگ آباد میں دکنی اردو بولنے کا انداز، مصوتوں کا اتار چڑھاو، ہائیہ اور غیر ہائیہ تلفظ وغیرہ دہلی کی زبان سے متاثر ہے جبکہ کرناٹک میں دکنی پر کنڑ کا اور آندھرا پردیش میں دکنی پر تلگو کا اثر ہے نیز ان علاقوں میں تلگو، مرہٹی اور کنڑ کا اپنا لہجہ اور تلفظ تبدیل ہوتا ہے اور اسی طرز پر دکنی کا تلفظ اور لہجہ بھی بدلتا ہے۔[۲۸] حیدرآباد میں دکنی کا جو انداز ہے وہ سومیل اور کرنول میں نہیں ہے اور اسی طرح بیجاپور اور گلبرگہ کے تلفظ میں بھی فرق ہے۔[۲۹]

ان محققوں کی بات سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ شمالی ہند کی مختلف بولیوں مثلاً برج بھاشا، کھڑی بولی اور ہریانی کے کئی الفاظ دکنی میں شامل ہوگئے اور ان کا تلفظ اور املا بھی مقامی اثرات کے تحت بدل گیا۔ کچھ مزید رنگ مرہٹی اور گجراتی کے الفاظ نے دکنی میں شامل ہو کر ملائے۔ ان زبانوں اور بولیوں کے اثرات نیز مقامی دراوڑی بولیوں کے اثرات (اگرچہ وہ ادبی زبان میں کم ہی رہے) سے دکنی اردو کی شکل اس عام اردو سے خاصی مختلف ہوگئی جو شمالی ہند میں بولی جاتی تھی۔ ان نکات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی متون میں بھی یہ اثرات کم یا بیش موجود ہوں گے اور ان کو سمجھے بغیر دکنی ادب کی درست تفہیم دشوار ہوگی۔

مختلف زمانوں اور خِطّوں کی دکنی اردو:

ایک اہم بات جس پر عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی یہ ہے کہ خود دکنی کی بھی کوئی ایک شکل نہیں تھی اور تمام زبانوں کی طرح اس میں بھی زمانی تغیر اور جغرافیائی فرق پیدا ہوتا رہا۔ کسی زبان میں وقت کے ساتھ ساتھ جو تغیر پیدا ہوتا ہے اسے لسانیات کی اصطلاح میں لسانی تغیر (language change) کہا جاتا ہے اور کسی زبان کی مختلف جغرافیائی خطوں، علاقوں یا طبقوں میں بولے جانے پر اس میں جو فرق پیدا ہوتا ہے اسے لسانیات کی اصطلاح میں لسانی فرق (language varaition) کہتے ہیں۔

دکنی اردو کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی کہ اس میں زمانی تغیر اور علاقائی فرق دونوں پیدا ہوئے اور یہ خصوصیات دکنی متون میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً قلی قطب شاہ کی دکنی اردو اور اس کے بعد کے دور کی دکنی اردو میں فرق ہے اور اسی طرح گولکنڈہ (یعنی حیدرآباد شہر کے قدیم قلعے کے آس پاس کا علاقہ) اور دکن کے دوسرے علاقوں مثلاً بیجاپور کی دکنی اردو میں بھی فرق تھا۔ لیکن اس تغیر و تبدل پر صحیح معنوں میں چند ہی لکھنے والوں نے توجہ دی

ہے۔البتہ ابو تراب ضامن خطائی نے دکنی لغت کے مقدمے کے آخر میں ''تصریح'' کے عنوان سے اہم باتیں بیان کی ہیں جو دکنی ادب کے طالب علموں بلکہ محققین کے لیے بھی مفید ہیں۔کہتے ہیں:

> ''دکھنی زبان کے جو مخطوطے ہم تک پہنچے ہیں اور جن کا متن تین چار پانچ سو سال کے طویل عرصے میں نسخ و مسخ ہو کر ہم تک پہنچا ہے دکھنی کے طالب علموں کے لیے عجیب و غریب معمے پیش کرتا ہے۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاہی نگرانی میں مرتب کیے ہوئے دیوان میں غوّاصی اور ملک الشعرا غواصی کے مطّلا و مذہب دیوان میں عبداللہ قطب شاہ اور ہاشمی کی غزلیں تخلص کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ملتی ہیں اور پھر اختلافِ نسخ کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک کتاب کے دو نسخے چالیس پچاس سال کے وقفے سے دو مختلف کاتبوں کے نقل کیے ہوئے ملیں تو ان دو مخطوطوں میں الفاظ کی شکلیں ، املا، تذکیر و تانیث کی صورتیں اور افعال کی شکلیں تک بدلی ہوئی ملتی ہیں۔ایسے نسخے جو بعد میں لکھے گئے ان کی زبان بھی قدامت کے لحاظ سے متاثر ہوتی گئی۔اس لحاظ سے دکھنی کی جو خصوصیات پندرھویں صدی میں تھیں وہ سولھویں صدی اور سترھویں صدی میں نہیں ملتیں۔اس کے علاوہ بیجاپور کی لسانی و صوتی خصوصات اور گولکنڈہ کی لسانی و صوتی خصوصیات میں نمایاں فرق نظر آتا ہے کیونکہ بیجاپور کی زبان پر مرہٹی اور کنڑی زبان کے اثرات زیادہ ہیں تو گولکنڈا کی زبان پر تلنگی اثرات مرتب ہوتے نظر آتے ہیں۔''(۳۰)

یہاں طالب علموں کی خدمت میں عرض ہے کہ گولکنڈہ دراصل وہ قدیم قلعہ ہے جو گیارھویں صدی عیسوی میں مقامی حاکموں نے بنایا تھا اور اس کے کھنڈرات اب بھی نئے حیدرآباد شہر کے قریب موجود ہیں۔نیا حیدرآباد شہر بعد میں بنایا گیا جس کی بنیاد قلی قطب شاہ نے ۱۵۹۱ء میں رکھی تھی۔لہٰذا اوپر کے مباحث میں گولکنڈہ سے مراد حیدآباد کا قدیم شہر ہے۔گویا یہاں گولکنڈہ کی لسانی و صوتی خصوصیات سے مراد ہے قدیم حیدرآباد کی خصوصیات جو بیجاپور سے مختلف تھیں۔(۳۱)

دکنی متون کی قرأت اور تفہیم کے مسائل:

دکنی متون کی تفہیم میں دشواری کا ایک سبب مذکورہ بالا بولیوں اور مقامی زبانوں کے الفاظ کا اردو کے اس املا میں لکھا جانا بھی ہے جو دکن میں اختیار کیا گیا۔نیز دکنی ادب کی قرأت اور تفہیم میں مشکلات کی وجہ دکنی اردو کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر دکنی ادب کے بعض متون کو پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے سمجھنا تو دور کی بات

ہے۔ان مشکلات کے ضمن میں حنیف نقوی نے کچھ اہم نکات اٹھائے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ان نکات کو یہاں مختصراً پیش کرنا ضروری ہے تاکہ دکنی متون کی تفہیم کے وقت ان متون کی صوتیاتی و صرفی و نحوی خصوصیات کو مدنظر رکھا جاسکے۔ حنیف نقوی کے وہ نکات یہ ہیں[۳۲] :

۱۔ دکنی مخطوطات میں ہائے سادہ(ہ)اور ہائے مخلوط(ھ)دونوں کے لیے دوچشمی ہا(ھ)کا استعمال۔

۲۔ دکنی متون میں دوچشمی ہا(ھ)کا اپنے سے قبل کے حرف سے مخلوط ہو جانا، مثلاً پڑھنا کے بجاے پھڑنا اور چڑھنا کے بجاے چھڑنا۔

۳۔ ہائے سادہ(ہ)کا حرفِ ما قبل کی طرف منتقل ہو کر اسے ہائے مخلوط لکھا جانا اور اس پر املا میں مزید تصرف، مثلاً آتش کدہ کو آتش کھنڈ لکھا جانا۔

۴۔ ہائے سادہ اور ہائے مخلوط دونوں کا املا سے غائب ہو جانا اور تدوین کرنے والوں کا اسے غلط پڑھنا، مثلاً وجہی نے سب رس میں ''دہرادہرا'' لکھا ہے لیکن اسے غلط طور پر ''ڈراڈرا'' پڑھا اور چھاپا گیا اور متن کے علاوہ دکنی لغات میں بھی اس کے مختلف معنی متعین کیے گئے [جو بظاہر غلط معلوم ہوتے ہیں]۔

۵۔ دکنی تلفظ میں کاف، گاف اور غین کا باہمی تبادلہ یا مقامی تلفظ کے لحاظ سے املا میں کسی حرف کا اضافہ، مثلاً قلغی کو قلگی لکھنا یا بگلا کو بغولا لکھنا۔

۶۔ کاف اور گاف کو ایک ہی مرکز کے ساتھ لکھنا، یاے معروف اور مجہول میں فرق نہ ہونا نیز نقطوں کا کم تعداد میں لکھا جانا (مثلاً آپ کو ب) یا نہ لکھا جانا۔

۷۔ کاتب کا اپنی طرف سے بعض حروف کی علامات لکھنا یا ایک ہی کاتب کے ہاں املا میں یکسانیت نہ ہونا بلکہ ہر بار ایک ہی لفظ کا مختلف املا لکھنا۔

۸۔ املا کا کوئی معین طریقہ یا معیار نہ ہونا، نیز املا کے لیے اردو املا سے مختلف علامات لکھنا مثلاً جزم کے لیے چھوٹی سی ہا(ہ)لکھنا اور گاف(گ)، رے(ر)، ڑے(ڑ)اور شین(ش)کے نیچے نقطے ڈالنا۔

۹۔ وزن کی خاطر شعرا کا بعض الفاظ کا املا توڑ مروڑ کر لکھنا، حروف کو یا امالہ کو حذف کر دینا، کسرہ(زیر)کی حرکت کو یا (ی) سے ظاہر کرنا یا ضمہ (پیش) کو واو سے ظاہر کرنا، مثلاً : توج (تجھ)، کُرڑ (کروڑ)، سرِ (سیر)، بغر (بغیر)، کوچ (کچھ)، جکیچ (جو کچھ)، جکوئی (جو کوئی)، اسّے (اس سے)، اِنّے (ان نے)، بھوت (بہت)، پو (پر)، جاگی (جائے گی)، لجانگی (لے جائیں گی)، کنّا (کہنا)، تج (تجھ)، منج (مجھ)، وو (وہ)، یے (یہ)، موکھ (مکھ)، بیجلی (بجلی)، اوڑے (اوڑھے)، بی (بھی)، وغیرہ۔

۱۰۔ جیسا بولنا ویسا لکھنا، مثلاً: اقل (عقل)، صفے (صفحے)، وخت (وقت)، منا (منع)، نفا (نفع)، وضا (وضع)۔

۱۱۔ دکنی زبان کی قواعدی تبدیلیاں، مثلاً فعلِ ناقص کے لیے اہے، اتھے، اچھے۔ فعلِ ماضی میں یا (ی) کا اضافہ ، مثلاً سُنیا، دیکھیا، بولیا، پڑھیا، چلیا وغیرہ۔

۱۲۔ نفی کے لیے نی، نئیں، نانھ، ناہیں (بجاے نہیں)۔

اس ضمن میں مسعود حسین خان نے قلی قطب شاہ کی زبان پر دیگر زبانوں کے اثرات پر اظہار خیال کیا ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔ وہ اس ضمن میں کہتے ہیں کہ قلی قطب شاہ کے دور تک دکن میں اردو تین سو ساڑھے تین سو برس میں ایک متعین شکل اختیار کر چکی تھی اور اس کا رشتہ شمالی ہند سے ٹوٹ چکا تھا، مراٹھی وہ واحد آریائی زبان تھی جو دکن کی مقامی اردو سے لین دین کر سکتی تھی۔ چنانچہ دکنی اردو میں جو صوتیاتی اور قواعدی خصوصیات پیدا ہوئی تھیں وہ اسے شمالی ہند کی اردو سے ممتاز کرتی ہیں اور وہ سب خصوصیات قلی قطب شاہ کے ہاں موجود ہیں۔[۳۳] اِنھیں خصوصیات کی بنا پر مسعود صاحب نے لکھا ہے کہ قلی قطب شاہ کے کلام کے بعض حصوں ''کی صحیح قرأت دکھنی اردو کے ماہرین کے لیے ابھی تک دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ اس کے اشعار باوزن طریقے پر پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں''[۳۴] لیکن بقول ان کے قلی قطب شاہ عروض پر پوری قدرت رکھتا تھا اور یہ فیصلہ کرنے سے قبل کہ اس کی شاعری بحر سے خارج ہے الفاظ کے املا کو دکنی صوتیات میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ مسعود حسین خاں نے سیدہ جعفر اور محی الدین قادری زور پر بھی گرفت کی ہے کہ انھوں نے قلی قطب شاہ کے کلام میں موجود مشکل الفاظ کے معنی یا تو چھوڑ دیے ہیں یا بعض مقامات پر دیے گئے معنی تشنہ اور غیر توضیحی ہیں ، بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ زور صاحب نے بعض معنی غلط بھی لکھے ہیں۔[۳۵] گویا قلی قطب شاہ کی زبان کو سمجھنا آسان نہیں ہے اور دکنیات کے بعض ماہرین سے بھی اس ضمن میں غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ جب دکن کے مقامی ماہرین بھی دکنی ادب کی تفہیم میں غلطی کر جاتے ہیں تو دکن سے باہر والوں کے لیے اس کو درست طور پر سمجھنا کتنا مشکل ہو گا۔

رہا شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا یہ شکوہ کہ جنوبی ہند کے اہلِ قلم کو اردو ادب کی تاریخ میں نظر انداز کیا گیا ہے تو ممکن ہے کہ میر تقی میر اور محمد حسین آزاد جیسے شمالی ہند سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے دکن، پنجاب اور گجرات کی ادبی و لسانی اہمیت کو شعوری یا لاشعوری طور پر کم کرنے کی کوشش کی ہو لیکن محمد حسین آزاد نے ولی دکنی کو اردو شاعری کا باوا بھی تو آدم قرار دیا (یہ اور بات ہے کہ تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہوئی)۔ دوسری طرف بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے لوگ بھی تو تھے جن کا تعلق یوپی (شمالی ہند) ہی سے تھا لیکن انھوں نے دکن، دکنی زبان اور

دکنیات پر وقیع کام کیا۔ مولوی عبدالحق نے قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ثابت کیا اور اس کے دیوان کا تعارف کروایا جبکہ یہ کام خود دکن والوں کے کرنے کا تھا۔ مولوی عبدالحق نے ملا وجہی کی سب رس مرتب کی جو یقیناً ادبی کارنامہ تھا۔ دکنیات پر مولوی صاحب ہی کی وجہ سے توجہ مبذول ہوئی اور بعد ازاں اہل دکن بالخصوص محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی اور عبدالقادر سروری وغیرہ نے دکنیات پر کام کیا بلکہ اس کے لیے انھوں نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے نام سے باقاعدہ ایک ادارہ حیدرآباد (دکن) قائم کیا جس نے دکنی ادب و زبان کی تحقیق میں گراں مایہ اضافے کیے۔

دوسرے یہ کہ سبھی ادبی تاریخ نویس اردو ادب کی تاریخ کا آغاز جنوبی ہند سے کرتے ہیں اور دکن کی خدمات اور اوّلیات کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگر کہیں کسی ادبی مؤرخ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اسے انسانی خطا پر محمول کرنا چاہیے یا انفرادی رویہ سمجھنا چاہیے۔ رہا سوال قلی قطب شاہ کے کلام یا دکنی ادب کے دیگر متون کی تفہیم کا، تو اس کے لیے دکنی اردو کی لغات بھی مرتب کی گئی ہیں اور ان میں سے بیشتر دکنی زبان اور ادب کی تفہیم میں کسی نہ کسی طور معاون ضرور ثابت ہوتی ہیں، اگرچہ ان میں سے اکثر تشنہ ہیں۔

بہر حال یہ تو تمہید تھی لیکن ذکر کچھ اور نکل آیا۔ یہاں دکنی اردو کی لغات اور فرہنگوں کا مختصر جائزہ پیش کرنا مقصود ہے:

۱۔ فرہنگِ عثمانیہ[۳۶] (۱۹۲۹ء)

اس کا مکمل نام 'فرہنگِ عثمانیہ المعروف بہ اصطلاحاتِ اسنادی' ہے۔ اس کے مولف نے اپنا نام یوں لکھا ہے: ابوالمعارف میر لطف علی عارف ابوالعلائی۔ سالِ اشاعت درج نہیں لیکن مولف کا دیباچہ ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۴۷ ہجری کا لکھا ہوا جس کی تطبیق ستمبر ۱۹۲۸ء سے ہوتی ہے اور آخر میں قطعۂ تاریخ ہے جس سے ۱۹۲۹ء کا سال برآمد ہوتا ہے۔ صفحات کی کل تعداد تین سو اٹھارہ ہے۔ بنیادی طور پر تو دفتری اصطلاحات کی فرہنگ ہے لیکن اس میں عام الفاظ بھی ملتے ہیں نیز اعلام بھی درج ہیں۔ بعض معلومات اہم ہیں۔ دراصل یہ ایک طرح کی دائرۂ معارفی (انسائیکلوپیڈیائی) فرہنگ ہے۔ ناشر کا نام یوں لکھا ہی:- ادارۂ ادبیہ، فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔

البتہ اصطلاحات کی تفصیلی وضاحت فرہنگ کے خاصے حصے پر محیط ہے۔ بعض اندراجات کی وضاحت میں غیر ضروری باتیں بھی لکھ دی ہیں مثلاً "آب کاری" کے اندراج کے تحت چھے (۶) صفحات میں سیندھی کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کے نشے کی کیا خصوصیات ہیں، اس کی کاشت کے علاقے کون سے ہیں، اس کا محصول کس طرح کا

ہے اور حکومت کو اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ شراب کے نقصانات بھی بتائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کا لغت نویسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ تین سو سترہ صفحات میں فرہنگ حرف ''ب'' سے شروع ہونے والے الفاظ تک ہی پہنچ سکی۔

راقم نے اس کا ایک نسخہ انجمن ترقیٔ اردو (کراچی) کے کتب خانے میں دیکھا ہے۔

۲۔ دکن کی زبان[۳۷] (۱۹۳۵ء؟)

اس کے مولف بھی، سرورق کے مطابق، عارف ابوالعلائی قاضی ہیں۔ کتاب میں ایک اور مقام پر اپنا نام ''ابوالمعارف میر لطف علی عارف ابوالعلائی قاضی'' لکھا ہے۔ مولف کے دیباچے کے آخر میں ۲۱ رمضان ۱۳۵۴ ہجری کی تاریخ درج ہے جس کی تطبیق نومبر ۱۹۳۵ء سے ہوتی ہے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں یا چند برس بعد شائع ہوئی ہوگی۔ ابتدائی چار (۴) صفحات میں دکن اور اس کی زبان اور وجہِ تالیف بیان کی ہے۔ پھر مزید چار (۴) صفحات میں فصاحت کے اصول چند مثالوں کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ان آٹھ (۸) صفحات کو چھوڑ کر یہ لغت اڑتالیس صفحات پر مبنی ہے، گویا کل چھپن (۵۶) صفحات ہیں۔ لیکن یہ لغت نامکمل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک ضخیم لغت کا پہلا حصہ ہے جو اڑتالیس صفحات پر مبنی ہے۔ پہلا اندراج ''آب'' ہے اور آخری اندراج ہے: ''ارس یا آرس چائوں سے پالیس''۔ البتہ آخری صفحے پر آخری اندراج کی تشریح کا صرف ایک لفظ لکھا گیا ہے جو ''دکن'' ہے۔ غالباً دوسرے حصے میں لغت کو تسلسل سے چلانا مقصود تھا مگر وہ غالباً شائع نہیں ہو سکا۔ کم از کم راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔

دیباچے سے پہلے ایک صفحے پر کہا گیا ہے کہ ''اس کتاب میں ایک لاکھ سے زائد محاورے اور روزمرہ درج ہیں'' اور اس کے بعد لکھا ہے کہ اسناد میں ممتاز شعرا خاص کر'' شہزادہ والاشان'' اور ''مہاراجہ شاد'' کے اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ پھر اطلاع دی گئی ہے کہ یہ کتاب تیس (۳۰) اقساط میں شائع ہو رہی ہے۔ اس کے بعد ملنے کا پتا درج ہے جو ''مطبع ادبیہ، سید علی اکبر، اکبر حیدرآبادی، ناملی'' ہے (ناملی حیدرآباد شہر کے ایک علاقے کا نام ہے)۔ لیکن بظاہر اس کی بقیہ اقساط شائع نہیں ہو سکیں اور ایک ہی حصہ شائع ہو سکا کیونکہ اس کی مزید اقساط کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

دیباچے میں مولف نے لغت کی تالیف کا بنیادی مقصد دکن کی اردو کو معدوم ہونے سے محفوظ کرنا اور اسے غیر فصیح ہونے کے الزام سے بچانا بتایا ہے۔ لیکن ان کی یہ بات بحث طلب ہے کہ ''فصحاے لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد کی زبان ایک تھی''۔ لغت کی تالیف کا مقصد بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ عوام کی یہ غلط فہمیاں کہ '' دکن کی قدیم زبان غیر فصیح ہے'' دور ہو جائیں۔[۳۸] دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

''پہلے دکن کی زبان کی روز مرہ بول چال اور محاورات کو بلحاظِ حروف تہجی لغت قرار دیا ہے پھر اس کا ترجمہ اور اس کی نظیر میں کوئی شعر نہ ملنے کی صورت میں فقرے لکھ دیے گئے ہیں۔اس کے بعد فصیح یا غیر فصیح کا بھی اظہار کر دیا گیا ہے۔واضح ہو کہ اس لغت میں ہم نے جہاں کہیں کوئی محاورہ خاص دکن کی زبان سے متعلق ہے تو اس کی صراحت کر دی ہے جس کی علامت -'دکن 'ہے۔جہاں اس امر کی کوئی صراحت نہیں ہے تو سمجھ لیا جائے کہ مشترکہ زبان اور محاورے ہیں جو دکن اور لکھنؤ دہلی میں قدیم سے مستعمل ہیں۔دکن کے شعراء کا کلام جو پیش کیا گیا ہے اس میں دکھنی سے مراد ۱۲۰۰ ہجری تک کے شعرا ہیں اور حیدرآبادی سے ۱۳۰۰ھ کے شعراء مراد ہیں۔''(۳۹)

دیباچے کے بعد اور لغت سے پہلے چار صفحات میں قواعد، انشا اور املا کے کچھ اصول ''فصحاے حال نے جو اصول قرار دیے ہیں وہ یہ ہیں'' کے عنوان کے تحت درج کیے ہیں۔جس کے بعد اپنا پورا نام یوں لکھا ہے : ''ابوالمعارف میر لطف علی عارف ابوالعلائی قاضی'' اور اس کے بعد اپنا پتا ''پرگنہ ہت نورہ'' لکھا ہے۔

کاتب نے کہیں کہیں، خاص طور پر دیباچے میں، ہاے مخلوط (ھ) کے بجاے کہنی والی ''ہ'' لکھی ہے اور کہیں نون غنے کے بجاے اعلانِ نون بھی نظر آتا ہے۔لغت میں پہلا اندراج ''آب'' کا ہے اور آخری اندراج ''آرس یا آرس چائوں سے پالیں'' کا ہے۔اکثر بہت مختصر تشریح دی ہے بلکہ کہیں کہیں تو دو یا تین لفظ ہی لکھے ہیں، مثلاً ''آپ بیتی'' کی وضاحت صرف ''اپنی سر گزشت'' سے کی ہے۔دیباچے میں کہا گیا ہے کہ نظیر میں شعر نہ ملنے کی صورت میں فقرہ لکھا گیا ہے لیکن در حقیقت بہت کم اندراجات کے ساتھ سند کے اشعار درج ہیں اور فقرہ بھی شاذ و نادر ہی درج کیا ہے۔جو الفاظ دکن سے مخصوص ہیں ان کے آگے ''دکن'' لکھا ہے، مثلاً ''آٹا بُکنی ہو گیا (دکن) بہت باریک ہو گیا''۔

لیکن یہ فہم سے بالاتر ہے کہ جب پہلا حصہ اڑتالیس صفحات پر مبنی ہے اور بقیہ حصے بھی اسی ضخامت کے ہوتے تو تیس (۳۰) حصوں میں ایک لاکھ اندراجات کیسے آسکتے تھے، کیونکہ ان اڑتالیس صفحات میں بیس (۲۰) اندراجات فی صفحہ کی اوسط مانی جائے تب بھی اس لغت میں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار اندراجات ہوں گے۔گویا تیس اقساط میں تیس ہزار اندراجات ہی آسکتے تھے۔

غرض لغت نویسی کے اعتبار سے کوئی بہت اہم کام نہیں ہے لیکن اب اس کی تاریخی ہمیت ہے کہ یہ دکنی اردو کے الفاظ و معنی کو منضبط کرنے کی ابتدائی کوششوں میں شامل ہے۔اردو لغت بورڈ (کراچی) کے کتب خانے میں

اس کا ایک نسخہ موجود ہے جو راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ لیکن اس کا لوح کا صفحہ غائب تھا جس سے ناشر وغیرہ کی معلومات کا علم نہ ہو سکا۔

۳۔ دکنی لغت[۴۰] (قیاساً ۱۹۴۰ء)

سید شعار احمد ہاشمی کی مرتبہ یہ لغت ضخامت کے علاوہ قامت کے اعتبار سے بھی مختصر ہے۔ اسے جیبی لغت (pocket dictionary) کہنا چاہیے۔ ساڑھے تین چار انچ ضرب تین انچ کی یہ لغت ایک سو اکیس صفحات (بشمول ضمیمہ) پر مشتمل ہے۔ تمہید اور تقریظ کے چھے (۶) صفحات اس کے علاوہ ہیں۔ ضمیمے میں وہ الفاظ شامل ہیں جو اصل لغت میں کسی وجہ سے درج ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔ دیباچہ بعنوان تمہید نیز تقریظ کے چھے (۶) صفحات اس کے علاوہ ہیں۔ اندراجات کی مجموعی تعداد اندازاً پندرہ سو (۱۵۰۰) ہو گی۔ سالِ اشاعت اور ناشر کے نام کا بھی علم نہ ہو سکا۔ علامہ عبداللہ عمادی کے قلم سے تقریظ ہے جس میں مولف کا پورا نام سید شعار احمد ہاشمی بتایا گیا ہے۔

مولف لکھتے ہیں کہ:

> ''ملک کے ہر گوشے سے دکنی تصنیفات کا سرمایہ فراہم کیا جا رہا ہے لیکن اس زبان کا کوئی لغت موجود نہ ہونے کے باعث دکنی لٹریچر پڑھنے اور سمجھنے میں سخت دشواریاں لاحق ہو رہی ہیں۔ غرض اس زبان کے ایک لغت کی سخت ضرورت تھی۔۔۔ نہایت افسوس ہے کہ دکن کے کسی اہل قلم نے اس جانب توجہ نہیں کی۔۔۔ آخر کار خاکسار شعار نے شعر اس ضرورت کو محسوس کیا۔۔۔ اور سالہا سال کے وسیع مطالعہ کتب ادبیہ اور دواوین کے بعد نہایت محنت سے اس لغت کو تالیف کیا۔''[۴۱]

اس کے بعد لکھا ہے کہ مولف کی حوصلہ افزائی کی گئی تو طبع ثانی میں بہت کچھ اضافہ و ترمیم کیا جائے گا نیز ایک '' مکمل و جامع دکنی لغتِ ضرب الامثال و محاورات و دیگر الفاظِ مروجہ و ضروریہ و الفاظِ مندرجہ کتبِ قدیمہ مع امثال و شواہد زیرِ ترتیب و تالیف ہے''۔ البتہ مولف کے کسی دوسرے لغوی کام کے بارے میں معلومات دست یاب نہیں ہیں اور مجوزہ و موعودہ لغت غالباً لکھی نہیں جا سکی۔

اپنی مختصر تقریظ میں عبداللہ عمادی نے لکھا ہے کہ دکن میں پانچ صدیوں سے دکنی زبان نہ صرف بولی جاتی ہے بلکہ اس زبان میں کئی ''دواوین و کتبِ ادبیہ'' بھی موجود ہیں مگر اس کے باوجود ''اب تک کسی نے اس زبان کے

متعلق کوئی چھوٹا یا بڑا لغت مدون نہیں کیا۔[۴۲] عبداللہ عمادی صاحب کا انتقال ۲۸ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا تھا[۴۳] اور گویا یہ تقریظ اس سے قبل لکھی گئی ہوگی۔ قیاس کہ یہ غالباً ۱۹۴۰ء کے آس پاس کے زمانے میں شائع ہوئی ہوگی۔

اس لغت کی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس میں عام طور پر اس اردو کے الفاظ بہت کم ملتے ہیں جو شمالی ہندوستان اور بقیہ ملک میں رائج تھی اور بیش تر الفاظ وہ ہیں جو دکنی اردو میں رائج تھے۔ اس لحاظ سے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ پھر اس کی تشریح کہیں کہیں کچھ تفصیل لیے ہوئے ہے گو عموماً دو یا تین مترادفات ہی معنی کے طور پر درج ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ''دکن کی زبان'' نامی لغت سے بہتر ہے (جس کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا)۔ پہلا اندراج ''آبشولہ'' کا ہے اور آخری اندراج ''یو'' کا۔ آخر میں (صفحہ ۱۰۵ سے ۱۲۱) ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں وہ الفاظ درج ہیں جو کسی وجہ سے پہلے درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اس لغت کا ایک نسخہ اردو لغت بورڈ (کراچی) کے کتب خانے میں موجود ہے۔

اس لغت کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس میں دکن میں بولی جانے والی اردو کے بعض دل چسپ الفاظ اور ان کے مختلف معنی درج کیے ہیں، مثلاً ''اپَن'' (یعنی میں یا ہم) تو بعض لغات میں مل جاتا ہے لیکن اس میں ''اپن'' کے علاوہ ''اپن تُپن'' (یعنی ہم تم) بھی درج ہے۔ اسی طرح بعض دیگر عام لیکن دل چسپ اندراجات جو دکنی ادب کی تفہیم میں معاون ہو سکتے ہیں کا اندراج بھی ہے، جیسے:

باج: بغیر، بِن۔ قلی قطب شاہ کا مصرع ہے: پیا باج پیالہ پیا جائے نہ۔

بھڑوُ: ساتھی، کھیل کا ساتھی۔ اس کا ایک تلفظ کراچی میں بعض لوگ بھیڑو (بیاے مجہول) کرتے ہیں اور ساتھی یا شریکِ کار کے مفہوم میں بولتے ہیں۔

توڑی: تلک، تک۔ جیسے اب توڑی یعنی اب تک۔

چلّر: ریزگاری۔ سکے۔ یا چونی اٹھنی کے مفہوم میں کراچی میں بعض لوگوں بالخصوص گجرات سے متعلق لوگوں کی زبانی سنا ہے۔

سچی مچی: سچ مچ۔ واقعی کے مفہوم میں۔

منج: مجھ۔

مینچ: میں ہی۔ ''چ'' دکنی میں حرفِ تاکید یا حرفِ حصر ہے اور ''ہی'' کے مفہوم میں بعض الفاظ کے آخر میں جڑ جاتا ہے۔

کوچ: (کوہی)، یہاں بھی ''چ'' بطور حرفِ تاکید یا حرفِ حصر آیا ہے۔

ویتاگ:آفت، مصیبت۔

البتہ لغت میں اعراب کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں ہے اور کہیں کہیں الفاظ پر اعراب لگا دیے گئے ہیں۔

۴۔دکنی اردو کی لغت[۴۴](۱۹۶۹ء)

مسعود حسین خاں اور غلام عمر خاں کی مرتبہ یہ لغت صحیح معنوں میں دکنی اردو کی پہلی ضخیم اور باقاعدہ لغت ہے۔بڑی تقطیع کے تین سو اکیاسی (۳۸۱) صفحات پر مبنی اس لغت میں تقریباً ساڑھے سات ہزار (۷۵۰۰)اندراجات ہوں گے۔آندھرا پریش ساہتیہ اکیڈمی (حیدرآباد) سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔لغت نویسی کے نقطۂ نظر سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے ہر اندراج کی سند دکنی کے کسی ادبی متن سے دی گئی ہے اور ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ متون کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے جن کے محققات کی فہرست ابتدا میں دی گئی ہے۔ان میں بعض بہت قدیم اور نادر مخطوطات بھی شامل ہیں۔گویا اس کی بنیاد کورپس (corpus) پر ہے اور یہ صحیح معنوں میں ایک علمی اور تحقیقی کام ہے۔

دیباچے میں مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ جو الفاظ اس لغت کے لیے جمع کیے گئے تھے ان کی تعداد ان الفاظ کے مقابلے میں تقریباً دوگنی تھی جن کو شامل کیا گیا ہے کیونکہ بقول ان کے کچھ الفاظ'' جدید اردو سے مماثلت رکھنے کی وجہ سے چھانٹ دیے گئے۔بعض ایسے الفاظ بھی خارج کر دیے گئے جن کے معنی آخر وقت تک مشتبہ رہے اور جو مرتب شدہ متون سے واضح نہ ہو سکے''۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس لغت میں کتنی تحقیق اور حزم و احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور اسی لیے اس کا درجہ دیگر دکنی لغات سے بہت بلند ہے۔البتہ اس میں ایک کمی جو کھٹکتی ہے وہ الفاظ پر اعراب نہ ہونا اور تلفظ واضح نہ کرنا ہے۔حالانکہ دکنی الفاظ کا تلفظ، بالخصوص غیر دکنی قاری کے لیے، بسا اوقات ایک معما بن جاتا ہے اور اسی سبب سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ قلی قطب شاہ کے بعض مصرعے ساقط الوزن ہیں حالانکہ وہ وزن میں ہیں اور درست تلفظ نہ کرنے کی وجہ سے خارج از بحر معلوم ہوتے ہیں۔ایسے مواقع پر اس تحقیقی بنیاد پر مرتب کی گئی مفید لغت میں تلفظ کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے۔

مسعود صاحب اور ان کے شرکائے کار کی نظر میں بعض الفاظ کے ''معنی مشتبہ رہنے'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی زبان اور اس کے ادب کی تفہیم کتنی مشکل ہے اور بعض دیگر لغات میں بعض دکنی الفاظ کے جو الل ٹپ معنی لکھ دیے گئے وہ کیسی گم راہی کا سبب ہو سکتے ہیں۔لیکن اعراب نہ ہونا بھی گم راہی کا سبب ہو سکتا ہے۔کاش اس طرف بھی توجہ کی جاتی۔

لغت میں بعض الفاظ کے ایسے معنی بھی سند کی مدد سے واضح کیے گئے ہیں جو مروجہ اردو سے مختلف ہیں یا ذرا سے مختلف تلفظ، املا کے حامل ہیں اور ایسے ہی الفاظ کی وجہ سے دکنی ادب کی تفہیم میں مغالطے پیش آتے ہیں ، مثلاً :

اگلا: اعلیٰ، بڑھ کر، زیادہ۔ شمالی ہند کی اردو میں اگلا اس مفہوم میں نہیں آتا۔

باون (۵۲): بہت زیادہ، کثیر تعداد میں۔ اردو میں کثرت کے لیے چھپن (۵۶) یا ستر (۷۰) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جیسے چھپن کروڑ کی چوتھائی۔

ٹھارنا: رکھنا۔ یہاں سب رس سے سند دی ہے: عشق کوں کوئی چھپا کر ٹھاریا ہے۔ جبکہ شمالی ہند کی اردو میں ٹھارنا کا مطلب ہے ٹھنڈا کرنا۔

ڈھولنا: ڈالنا۔ اردو میں ڈھورنا (رے سے) ہے جو گرانا، ڈالنا یا بہانا کے مفہوم میں ہے۔ اور ڈھولنا (لام سے) اردو میں مصدر نہیں اسم ہے، معنی ہیں ڈھول

کی وضع کا ایک زیور یا تعویذ، یہ بڑی روٹی کو بھی کہتے ہیں اور اس کا ایک مفہوم ہے: گھڑے کی شکل کا ایک دھاتی برتن۔

ڈھیگ: تودہ، ڈھیر۔ اردو میں ڈھیر ہے۔

ذات: ڈیل ڈول۔ اردو میں ذات گوت، نسل، نوع اور وجود وغیرہ کے معنی میں آتا ہے۔

ذوق کرنا: لطف اندوز ہونا۔ اردو میں ایسے موقعے پر شوق کرنا بولتے ہیں۔

راتنا: فریفتہ ہونا، دیوانہ ہونا۔ اردو میں راتنا کا لفظ رنگنا یا سرخ رنگ میں رنگنا کے مفہوم میں مستعمل ہے جو ''رتّا'' (یعنی سرخ) سے ہے۔

ضرب: رعب داب۔ اردو میں چوٹ کے معنی میں آتا ہے۔

۵۔ دکھنی لغات[۴۵] (۱۹۷۰ء/۲۰۰۰ء)

اس کے مولف سید ابو تراب خطائی ضامن ہیں اور اسے اردو لائبریری سنٹر، بنگلور، نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا۔ لوح سے معلوم ہوتا ہے کہ ضامن صاحب مہارانی کالج، میسور، میں صدرِ شعبۂ فارسی و اردو تھے۔ اس کے صفحات کی تعداد ایک سو باون (۱۵۲) ہے۔ ابتدا میں مرتب نے مقدمے میں دکنی زبان و ادب کے مختلف ادوار کے موضوع پر بحث کی ہے نیز دکنی زبان کی خصوصیات بتائی ہیں۔ اس کا ذکر سطورِ بالا میں ہم کر چکے اس لیے اسے یہاں دہرایا نہیں جا رہا۔

پیش لفظ میں خضر علی خان نے لکھا ہے کہ نظامی بیدری سے لے کر سراج اورنگ آبادی کے زمانے تک کے تین سو برسوں کے دکنی اہلِ قلم کی تصانیف سے اس لغت میں دکنی الفاظ جمع کیے گئے ہیں۔بقول ان کے یہ تصانیف کوہِ وندھیاچل سے آصف جاہی دور کے حیدرآباد[دکن] تک پھیلی ہوئی ہیں۔البتہ مولف نے مدراسی اور میسوری دکھنی کے الفاظ اس میں شامل نہیں کیے۔ان کے مطابق مولف نے اس میں پانچ ہزار الفاظ شامل کیے ہیں۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ ابوتراب خطائی ضامن کی اس میدان میں پہلی کوشش ہے۔ظاہر ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے اوراس سے پہلے دکنی لغات لکھی جاچکی تھیں۔

لغت کتاب کے صفحہ چھبیس(۲۶) سے شروع ہوتی ہے اور صفحہ ایک سو سینتالیس پر لغت کا اختتام ہو جاتا ہے۔گویا لغت کے صفحات کی کل تعداد ایک سو اکیس(۱۲۱) ہے اور ان صفحات میں لغت کے علاوہ ضرب الامثال اور عورتوں میں رائج الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کا دس صفحات پر مشتمل الگ حصہ بھی شامل ہے۔نصف صفحے پر ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں سولہ(۱۶) شامل ہیں جو غالباً ابتدا میں کسی وجہ سے درج ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔کتابیات اس کے علاوہ ہے۔ہر صفحے پر دو کالم ہیں اور ایک کالم میں اوسطاً سترہ اٹھارہ اندراجات ہیں۔اس طرح پانچ ہزار تک اندراجات اس لغت میں شامل ہوں گے۔لیکن بیش تر تشریح کے بجاے مترادفات درج کیے ہیں اور اکثر اندراجات میں ایک ہی لفظ بطور مترادف لکھا گیا ہے۔

اس لغت کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا جس کے سرورق پر ''مع ترمیم واضافہ'' درج ہے اور محمد صبغۃ اللہ اور سید ابوتراب خطائی ضامن کے نام بطور مرتبین لکھے ہیں(ناشر: مالک پبلی کیشنز، بنگلور)۔عرضِ ناشر کے تحت لکھا ہے کہ اس لغت کے پہلے ایڈیشن کی تدوین میں مرتب ضامن صاحب نے ''مسموعات'' کو جمع کیا تھا۔البتہ نئے مرتب صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس میں کیا ترمیم کی گئی ہے اور کیا اضافہ کیا گیا ہے، سوائے اس کے کہ اس کو کمپیوٹر پر کمپوز کیا گیا ہے۔دوسری افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں سے اصلی مرتب کا نہایت مفید اور تحقیقی مقدمہ حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی کوئی وضاحت بھی نہیں کی گئی۔اس دوسرے ایڈیشن سے چھوٹا سا ضمیمہ جو سولہ الفاظ پر مشتمل تھا نیز خواتین میں رائج الفاظ بھی اُڑا دیے گئے ہیں۔کتابیات البتہ موجود ہے۔

۶۔دکنی فرہنگ[۴۶](۱۹۷۲ء)

امیر عارفی کی یہ فرہنگ دراصل چھے دکنی مثنویوں کی فرہنگ ہے۔وہ مثنویاں یہ ہیں: گلشنِ عشق، من لگن، قطب مشتری، سیف الملوک وبدیع الجمال اور طوطی نامہ۔یہ فرہنگ ۱۹۷۲ء میں ادبی اکیڈمی(حیدرآباد) سے شائع ہوئی۔بیشتر اندراجات کے معنی میں ایک مترادف لفظ لکھ دیا گیا ہے۔دیباچے اور لغت سمیت کل اسی

(۸۰)صفحات ہیں۔اندازہ ہے کہ ڈھائی ہزار کے قریب اندراجات ہوں گے۔نصابی ضروریات کے پیشِ نظر مرتب کی گئی ہے اور زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

۷۔قدیم اردو کی لغت[۴۷](۱۹۷۳ء)

جمیل جالبی کی مرتبہ یہ لغت بظاہر تو قدیم اردو کی لغت ہے لیکن اردو کے قدیم ترین ادب کا بیشتر سرمایہ چونکہ دکنی دور سے تعلق رکھتا ہے اور شمالی ہند کے ادبی متون دکن کے بعد کے زمانے ہی میں ملتے ہیں لہٰذا لامحالہ اس لغت میں دکنی کے الفاظ کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ناشر اشفاق احمد نے اپنے تعارف میں لکھا ہے کہ :

''قدیم اردو کی لغت ولی گجراتی اور اس سے قبل کی تصانیفِ نظم و نثر کے ذخیرۂ الفاظ کا احاطہ کرتی ہے۔مولف نے دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے وسط تک کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کو جانچ کر ان میں سے ان الفاظ اور تراکیب کو بطور خاص اس لغت میں شامل کیا ہے جن کے مطالب اور معنی قدیم اردو ادب کے استادوں اور طالب علموں پر آسانی سے کھلتے نہ تھے۔''[۴۸]

لیکن اس لغت میں ایک بڑی کمی مسعود حسین خاں و غلام عمر خاں کی مرتبہ لغت کی طرح یہ ہے کہ اس میں بھی تلفظ بتانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔پھر ہر اندراج کے معنی کے لیے صرف چند مترادف الفاظ لکھ دیے گئے ہیں بلکہ اکثر صورتوں میں صرف ایک مترادف درج ہے۔مولف نے اپنے پیش لفظ میں یہ تو بتایا ہے کہ اس میں تقریباً گیارہ ہزار اندراجات ہیں لیکن پیش لفظ میں قدیم اردو، دکنی الفاظ اور ان کی خصوصیات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی حالانکہ جالبی صاحب ان معدودے چند اہلِ علم میں شامل تھے جنھوں نے دکنی ادب اور قدیم اردو ادب کے تقریباً ہر دست یاب متن کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔اسی طرح انھوں نے حوالے یا اسناد بھی نہیں دیں کہ جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ لفظ دکنی ادب کے کس متن میں اور کس زمانے میں برتا گیا ہے۔جبکہ مسعود حسین خاں اور غلام عمر خاں کی مرتبہ دکنی فرہنگ میں ہر اندراج کے ساتھ استعمال کی سند اور ماخذ کا نام درج ہے جو لغت نویسی کا مستند و مسلمہ طریقہ ہے اور جس سے لفظ کے مفہوم کے بارے میں شبہات نہیں رہتے۔خاص طور پر دکنی متون میں اغلاط اور ان کے مخصوص املا اور کتابت کے انداز (جس کا کچھ ذکر اوپر آیا ہے) کو مدنظر رکھتے ہوئے اسناد کا اندراج ضروری تھا اور جالبی صاحب اس کام کے پوری طرح اہل بھی تھے۔

دونوں لغات کا موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسعود صاحب نے سند پر دار و مدار رکھا ہے اور جالبی صاحب نے سند کہیں نہیں دی لیکن جالبی صاحب کے ہاں کچھ ایسے الفاظ و معنی ملتے ہیں جن کا مسعود صاحب کے ہاں نہ ہونا تعجب کا باعث ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو گی کہ مسعود صاحب کو ان الفاظ یا ان کے مفہوم کی سند نہیں مل سکی

ہو گی۔البتہ بعض اندراجات کے مفاہیم میں جالبی صاحب حق بجانب نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر لفظ ''بھاگ'' کو لیجیے،دکنی کی طرح یہ اردو اور ہندی میں بھی دیگر مفاہیم کے ساتھ ''قسمت'' کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔جالبی صاحب نے قدیم ردو کی لغت میں '' بھاگ'' کے تمام مفاہیم ایک ساتھ لکھ دیے ہیں جو یہ ہیں: حصہ، سمت، قسمت، قول، تقدیر۔جبکہ دکنی اردو کی لغت (مرتبہ مسعود حسین خاں و غلام عمر خاں)بھاگ کا دو بار اندراج کیا گیا ہے،ایک بار ''ایکٹ، سین، موسیقی کے انداز'' کے مفہوم میں اور دوسری بار ''قسمت'' کے مفہوم میں اور پھر مسعود صاحب کی دکنی اردو کی لغت میں ''بھاگ بھروسا'' کا اندراج ہے جس کے معنی دیے ہیں '' تسلی''اور بھاگ دینا کے معنی دیے ہیں تسلی دینا۔لیکن اس کی سند میں جو شعر دیا ہے اس کے ایک مصرعے سے ''بھاگ دینا'' کا مفہوم ''قول دینا'' بھی نکل سکتا ہے۔مصرع یہ ہے :

حنیف شاہ کوں آیا ہوں دے آپ بھاگ

یہاں بھاگ کا مفہوم قول بھی لیا جا سکتا ہے۔یعنی جالبی صاحب نے ''بھاگ'' کے ایک معنی جو '' قول ''لکھے ہیں اس کی بنیاد غالباً اسی طرح کا کوئی استعمال ہو گا۔گویا مسعود صاحب کے ہاں احتیاط غالب ہے اور انھوں نے بغیر سند کے کوئی اندراج لغت میں نہیں دیا۔جالبی صاحب اگر سند دے دیتے تو بعض مفاہیم زیادہ واضح اور مستحکم ہو جاتے اور یہ لغت زیادہ مفید اور زیادہ مستند ہو جاتی۔اس کے مقابلے میں سیدہ جعفر نے اپنی مرتبہ ''دکنی لغت ''(اس کا ذکر آگے آرہا ہے)میں ''بھاگ'' کے معنی صرف '' قسمت،نصیب'' دیے ہیں اور اس مفہوم کی چار اسناد درج کی ہیں اور یہاں مزید مطالب و مفاہیم کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ممکن ہے انھوں نے بھی سند نہ ملنے پر مزید مفاہیم نہ لکھے ہوں۔

دوسری طرف اردو لغت بورڈ نے اپنی لغت [۴۹] میں ''بھاگ'' کے ایک معنی ''بھاگنا'' کا امر لکھے ہیں اور اس کا اشتقاق اس '' بھاگ'' سے الگ دیا ہے جو قسمت وغیرہ کے مفہوم میں ہے نیز قسمت کے مفہوم میں لفظ '' بھاگ ''کو دوبارہ درج کیا ہے جو لغت نویسی کے اصول کے عین مطابق اور درست ہے۔اس اندراج میں ''بھاگ'' کے مختلف مفاہیم کی جو اسناد دی گئی ہیں ان میں دکنی ادب کی بھی اسناد شامل ہیں البتہ بورڈ کی لغت میں یہاں اسناد کی کمی ہے۔پھر یہ کہ ''بھاگ'' کے تحتی یا ذیلی مرکبات مثلاً بھاگ بھری، بھاگ بھرج، بھاگ پھل وغیرہ میں بورڈ نے کوئی سند نہیں دی اور بعض لغات کا نام درج کر دیا ہے جو تاریخی اصولوں پر لکھی گئی لغت کی قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی ہے۔ان مرکبات میں سے بعض کی اسناد دکنی متون سے دست یاب ہو سکتی ہیں اور اس لغت کے دوسرے نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن (جس کا امکان اب بہت کم رہ گیا ہے) میں ان اسناد کا اضافہ کیا جانا چاہیے۔

۸۔ بحر المعانی: دکنی اردو کا لغت[۵۰] (۱۹۸۷ء)

سطورِ بالا میں ایک لفظ کے مختلف معنوں کا ذکر ہوا۔ جاوید وشسٹ صاحب نے اپنی مرتبہ لغت 'بحر المعانی: دکنی اردو کا لغت' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مختلف فرہنگ نگاروں نے ایک ہی لفظ کے مختلف معنی لکھے ہیں ، وہ بحر المعانی میں یکجا ہو گئے ہیں"[۵۱] لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس لغت میں بعض اہم الفاظ کا اندراج ہی نہیں ہے، مثال کے طور پر لفظ" بھاگ" درج نہیں ہے کہ ہم یہاں اوپر کی سطور میں درج بھاگ کی بحث کے سلسلے میں اس لغت سے کچھ رہنمائی لے سکیں۔ البتہ بھاگ بھروسا (جس کا املا انھوں نے بھاگ بھروسہ دیا ہے) درج ہے اور معنی لکھے ہیں "روزمرہ، اطمینان (سب رس)"۔ غالباً لفظ روزمرہ کو بھی یہاں قوسین میں درج ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ معنی بحث طلب ہیں۔

مولف کے مطابق اس لغت میں گیارہ ہزار اندراجات ہیں۔ تقریباً سات سو صفحات کی اس لغت میں انھوں نے کم و بیش ہر اندراج کے بعد ماخذ کا نام درج کیا ہے۔ بعض اندراجات کے ساتھ ماخذ درج نہیں ہے۔ لیکن سیدہ جعفر کا اپنی دکنی لغت کے مقدمے میں یہ کہنا کہ جمیل جالبی کی قدیم اردو کی لغت اور جاوید وشسٹ کی بحر المعانی میں دکنی متن سے مثالیں پیش نہیں کی گئیں اور مآخذ کی نشان دہی بھی نہیں کی گئی، درست نہیں ہے۔ یہ بات جالبی صاحب کی قدیم اردو کی لغت کے بارے میں تو درست ہے لیکن بحر المعانی کے بارے میں نہیں۔ بحر المعانی میں دکنی متن سے مثالیں (یعنی استعمال کی اسناد) بے شک موجود نہیں ہیں لیکن ماخذ کی نشان دہی بیشتر اندراجات میں کی گئی ہے۔

بحر المعانی میں بعض الفاظ سید شعار ہاشمی کی دکنی لغت (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) سے لے کر درج کیے گئے ہیں اور اس کا قوسین میں حوالہ دیا گیا ہے حالانکہ اصولاً اس متن کا حوالہ چاہیے جس سے یہ لفظ اخذ کیا گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بحر المعانی میں بعض ایسے الفاظ و مرکبات کا بھی اندراج ہے جو بعض دیگر دکنی لغات میں نہیں ملتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مولف نے دکنی ادب کی تدریس کے دوران میں دکنی متون سے خود الفاظ و معانی جمع کیے تھے۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ کم از کم ہر اندراج کی سند بھی دیتے۔ مثالی صورت تو لغت نویسی میں یہ ہوتی ہے کہ استعمال کی سند کسی مستند متن سے مع صفحے کے حوالے کے دی جائے تاکہ بعد میں آنے والے لغوی یا محقق ان کی تصدیق کر سکیں۔

اس لغت میں بہر حال بیشتر صورتوں میں ماخذ کی نشان دہی کی گئی ہے جو ایک مثبت پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس لغت کے معیار پر سوال بھی اٹھتے ہیں کیونکہ بعض الفاظ کا اندراج عجیب ہے، مثلاً ایک لفظ "چھیکری" اس لغت میں درج ہے اور معنی لکھے ہیں "ایک چڑیا"۔ یہ لفظ کسی اور دکنی لغت میں درج نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے

کہ یہ دکنی کا لفظ نہیں ہے جیسا کہ مولف کے قوسین میں ''تلسی داس'' لکھنے سے ظاہر ہے۔ تلسی داس سنسکرت، برج بھاشا اور اودھی کا شاعر تو مانا جاتا ہے لیکن دکنی کا نہیں۔ اس لیے اس لفظ کا اندراج قدیم اردو کی لغت میں تو ہو سکتا ہے، دکنی لغت میں نہیں۔ ''بجد'' کے معنی لکھے ہیں ''ہمہ تن، مصروف'' اور دکنی مثنوی سیف الملوک [و] بدیع الجمال کا نام قوسین میں لکھا ہے۔ یہاں ''ہمہ'' کے بعد لگائے گئے کامے کو غیر ضروری اور کاتب کا سہو مانا جائے تب بھی معنی غلط ہی رہیں گے کیونکہ ''بجد'' دراصل ''بضد'' کا بگاڑ ہے اور اردو لغت بورڈ نے یہی معنی درج کرتے ہوئے دکنی کی معروف مثنوی قطب مشتری سے سند دی ہے۔[۵۲] گویا دکنی میں بھی اس کے وہ معنی نہیں جو مولف نے لکھے ہیں۔ اس طرح اس لغت کے معیار اور استناد پر سوال اٹھتے ہیں۔

۹۔ دکنی لغت وتذکرۂ دکنی مخطوطات[۵۳] (۲۰۰۲ء)

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نظام کالج میں اردو کے استاد تھے دہلی کی ٹکسالی زبان اور بیگماتی زبان پر عبور تھا اور جب دکن گئے تو وہاں کی زبان سے دل چسپی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے مخطوطات کے علاوہ بعض نوادرات بھی جمع کیے تھے۔[۵۴] ان مخطوطات میں دکنی کی کئی قلمی کتابیں تھیں۔ ان کی لغت مرتب کر رہے تھے اور مخطوطات کی وضاحتی فہرست بھی زیر ترتیب تھی لیکن مکمل نہ کر سکے[۵۵] اور بعد ازاں ان دونوں کاموں کو مغنی تبسم نے مرتب و مدون کر کے شائع کیا۔ لیکن جب آغا صاحب نے دکنی لغت مرتب کرنی شروع کی تو ان کے سامنے کوئی نمونہ نہیں تھا اور اس وقت تک شعار ہاشمی کی دکنی لغت شائع تو ہو چکی تھی مگر وہ بھی پیشِ نظر نہیں تھی۔[۵۶] ان کی لغت کے دو ماخذ تھے ایک دکنی ادب کے مخطوطات جو انھوں نے جمع کیے تھے اور دوسرے حیدر آباد کی بول چال۔[۵۷]

لغت صفحہ ۱۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۸۵ پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد تقریباً پینسٹھ (۶۵) صفحات میں دکنی مخطوطات کی وضاحتی فہرست ہے جس میں اڑتیس (۳۸) مخطوطات کا ذکر ہے، ان میں بعض نہایت اہم اور بہت نادر ہیں۔ چونکہ لغت میں اندراجات کے ساتھ اسناد بھی دی ہیں اور بعض صورتوں میں ایک سے زیادہ اسناد دی ہیں نیز کہیں کہیں وضاحتی شذرے بھی لکھے ہیں لہٰذا اندراجات کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ راقم کا اندازہ کہ بارہ سو سے کچھ زائد الفاظ و مرکبات درج ہیں۔

مغنی تبسم نے اپنے دیباچے میں بعض اہم نکات واضح کیے ہیں، مثلاً یہ کہ لغت میں بعض الفاظ کی تشریح میں اہم تہذیبی اور تاریخی جھلکیاں موجود ہیں۔ اس کی مثال میں انھوں نے لغت میں شامل ایک اندراج ''پانی نہانا'' پیش کیا ہے۔ بظاہر ''نہانا'' کہنا کافی ہے اور حیدر آباد سے باہر کے لوگوں کے لیے پانی کا لفظ یہاں عجیب یا اضافی معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل یہ اشارہ ہے کہ کسی زمانے میں حیدر آباد کے لوگ گلاب، کیوڑے اور مشک سے بھی نہاتے

تھے۔ دکن کے حاکم ابوالحسن تاناشاہ کے حوض گلاب اور کیوڑے کے عطر سے بھرے رہتے تھے۔ چنانچہ جب عطرِ گلاب اور کیوڑے کے حوض اُڑ گئے تو نرا پانی رہ گیا۔[۵۸] گویا گلاب نہانا کی تخصیص اور پانی سے نہانے کی وضاحت کے لیے پانی نہانا کا مرکب استعمال ہوتا ہوگا۔ لغت میں بڑی تعداد میں ایسے الفاظ شامل ہیں جو کسی اور دکنی لغت میں نہیں ملتے۔ دراصل آغا صاحب حیدرآباد کی زبان کے الفاظ اپنے پاس درج کرتے رہتے تھے اور وہاں کے شرفا سے ان کے استعمال اور مفہوم کی تصدیق کرتے تھے۔[۵۹]

مرتب نے چار دیگر لغات سے اس لغت کے مندرجات کا موازنہ بھی کیا ہے اور مختلف مفہوم کی صورت میں مختصراً بتایا ہے کہ ان لغات میں اس لفظ یا مرکب کے کیا معنی درج ہیں۔ لیکن یہ اہتمام ہر اندراج کے ساتھ نہیں ہے۔ بعض بہت نادر قلمی کتابوں کے حوالوں اور اسناد کی وجہ سے یہ لغت بہت اہم ہے۔ ایک اور خاص بات مقامی رسوم و رواج اور عورتوں کی زبان کی وضاحت ہے۔ مثلاً ''کھڑا کھڑی کی سپاری'' کے بارے میں لکھا ہے کہ دکنی عورتوں کی ایک قسم کی نیاز ہے۔ بعض مقامی نباتات یا دیگر مظاہر کا بھی ذکر ہے، جیسے: کویٹ، ایک قسم کا کھٹ مِٹھا پھل ہے۔

اس لغت کا ذخیرۂ الفاظ بہت اہم اور متنوع ہے اور کسی نئی دکنی لغت کی تدوین میں اسے نظر انداز نہیں جا سکتا۔

۱۰۔ دکنی لغت[۶۰] (۲۰۰۸ء)

سیدہ جعفر صاحبہ دکنی ادب کی معروف محققہ تھیں۔ خود دکن سے تعلق رکھنے، دکنی ادب پر گہری نظر رکھنے اور دکنی مخطوطات تک رسائی کے سبب ان کی دکنی لغت کا درجہ اندراجات کی جمع آوری اور اسناد کی فراہمی کے لحاظ سے بلند ہے تاہم تشریح اور لغت نویسی کے اصولوں کے ضمن میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اس لغت میں ہر اندراج کی سند دی ہے اور ماخذ کے نام بھی لکھے ہیں۔ ان کی مرتبہ اس لغت کو تمام دکنی لغات میں ضخیم ترین ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس میں تقریباً تیرہ ہزار اندراجات ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر بعض معنی تشنہ نظر آتے ہیں، مثلاً، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، لفظ بھاگ کے صرف ایک معنی لکھے ہیں اور اس کے استعمال کی چار اسناد دی ہیں۔ ممکن ہے کہ مزید مطالب کی اسناد انھیں نہ ملی ہوں۔

البتہ تشریح اکثر تشنہ ہے۔ لغت نویسی میں تشریح نگاری کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن اردو کے اکثر لغت نویسیوں اور بالخصوص فرہنگ نویسوں نے اسے مترادفات کی فہرست سازی سمجھ لیا ہے۔ دوسرے یہ کہ سیدہ جعفر صاحبہ نے لغت نویسی کے بعض بنیادی اصولوں کی پابندی نہیں کی۔ مثال کے طور پر لغت نویس کو دیکھنا ہوتا ہے کہ

کوئی لفظ یا مرکب جو وہ درج کرے اس کی حیثیت لغوی اندراج (lexical entry) کی ہے یا نہیں بصورتِ دیگر اسے لغت (یعنی بامعنی لفظ جو تشریح طلب اور لغت میں اندراج کے قابل ہو) نہیں سمجھا جائے گا۔ مثال کے طور پر کسی فعل کے مضارع یا ماضی (مثلاً، سنا، سنے، سنائے، آیا، آئے) کا اندراج لغت میں نہیں ہوتا بلکہ مصدر کا ہوتا ہے (جیسے سننا، سنانا، آنا)۔ اسی طرح اسم کی محرف حالت درجِ لغت نہیں ہوتی، مثلاً "لڑکے"، "لڑکیوں" وغیرہ کا اندراج لغت میں نہیں ہوتا بلکہ واحد اور قائم حالت یعنی "لڑکا" یا "لڑکی" کا اندراج ہوتا ہے۔ اس لغت میں اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا اور اکثر اندراجات اپنی قائم حالت یا مصدری حالت کے بجائے متن میں استعمال کے لحاظ سے درج کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر "گھیگائے" کا اندراج ہے اور معنی لکھے ہیں "عاجزی کرے"۔ جبکہ اس سے قبل وہ "گھیگانا" درج کر کے اس کے معنی "گھگیانا، منت سماجت کرنا" لکھ چکی تھیں۔ اگرچہ دونوں میں سند دی ہے لیکن چاہیے یہ تھا کہ ایک ہی بار "گھیگانا" کا اندراج کرتیں اور دونوں اسناد اسی میں شامل کر دیتیں۔ ایک اور مثال دیکھیے۔ ایک اندراج ہے: جھلجھلائے" معنی تو درست لکھے ہیں یعنی چمکنا لیکن اس اندارج کو "جھلجھلانا" کے طور پر درج کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ سند میں مصدر نہیں ہے بلکہ "جھلجھلائے" استعمال ہوا ہے اس لیے فعل کی وہی صورت لکھی ہے جو سند میں ہے۔ لیکن یہ لغت نویسی کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اسناد (بقول ان کے "متن سے مثالیں") کے ضمن میں انھوں نے محنت کی ہے، اگرچہ متون کے صفحات کے نمبر کہیں نہیں دیے لیکن اسناد نقل کر کے ماخذ کا نام بھی دیا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔

مختصراً یہ کہ یہ دکنی لغات بہت اہم ہیں اور دکنی متون کی تفہیم میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، اگرچہ ان میں سے اکثر تشنہ ہیں اور کئی دکنی الفاظ جو دکنی کے ادبی متون میں ملتے ہیں کسی دکنی لغت میں درج نہیں ہیں۔ امید ہے کہ کوئی ایسی جامع دکنی لغت لکھی جائے گی جس میں وسیع تر ذخیرۂ الفاظ کا احاطہ کیا جائے گا اور جس میں لغت نویسی کے اصولوں اور اسناد کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

حواشی

(۱) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو فاروقی صاحب کا مضمون: ایک عاجزانہ التماس: کیا ہمیں اردو ادب کی ایک موزوں تاریخ نصیب ہو سکتی ہے؟ مشمولہ اردو ادب (دہلی، جنوری۔مارچ ۲۰۲۰ء) ص ۲۳۔۷۔

(۲) شمس الرحمٰن فاروقی، محولۂ بالا، ص ۹۔

(۳) ایضاً، ص ۱۳۔

(۴) ایضاً، ص ۱۹۔

(۵) ممتاز حسن، دیباچہ، خاور نامہ (کراچی: ترقیِ اردو بورڈ، ۱۹۶۸ء)، ص الف۔

(۶) طالب علموں کی رہنمائی کے لیے عرض ہے کہ بیجاپور بھی دکن کا حصہ تھا اور اب بھارتی ریاست کرناٹک میں شامل ہے نیز یہ کہ اب دکن نام کی کوئی ریاست یا صوبہ ہندوستان میں نہیں ہے۔آزادی کے بعد سابقہ دکن کے علاقے مختلف صوبوں میں شامل کر لیے گئے اور حیدرآباد شہر (جسے حیدرآباد سندھ سے متمیز کرنے کے لیے حیدرآباد دکن لکھتے تھے) پہلے ریاست آندھرا پردیش کا حصہ رہا اور اب ریاست تلنگانہ میں شامل ہے۔ہندوستان میں صوبے کو اسٹیٹ (state) یعنی ریاست کا نام دیا گیا ہے۔

(۷) جمیل جالبی نے تاریخِ ادبِ اردو میں باب کے عنوان کی سرخی میں سال ۱۵۸۰ء۔۱۶۱۰ء لکھا ہے جو دورِ حکومت کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس میں ۱۶۱۰ء لکھنا بحث طلب ہے، کیونکہ وہ اپنی وفات تک حاکم رہا تھا۔اس کا انتقال جیسا کہ خود جالبی صاحب نے لکھا ہے ۱۶۱۱ء میں ہوا، دیکھیے: جلد ۱ (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۸۴ء (ص ۴۱۰ (طبعِ دوم)۔سیدہ جعفر نے کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ کے مقدمے میں سالِ پیدائش ۱۵۶۵ء (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء) لکھا ہے، ص ۲۴، اور انھوں نے سالِ وفات ۱۰۲۰ ہجری لکھا ہے جس کی مطابقت ۱۶۱۱ء سے ہوتی ہے، ص ۶۰۔لیکن محی الدین قادری زور نے ۱۷ ذیقعد ۱۰۲۰ ہجری تاریخ وفات دی ہے (مقدمہ کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ، حیدرآباد دکن: مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۹۴۰ء)، ص ۳۲۱۔۳۲۰؛ جس کی مطابقت ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء سے ہوتی ہے (ضیاء الدین لاہوری، جوہرِ تقویم، جمیعۃ پبلی کیشنز، ۲۰۰۴)۔اس مہینے اور سال کو درست مانا جائے تو سالِ وفات ۱۶۱۲ء ٹھہرتا ہے۔ابرار عبدالسلام نے بھی تاریخ گلزارِ آصفیہ کی فارسی عبارت نقل کی ہے جس کے مطابق محمد قلی قطب شاہ کی تاریخِ وفات ۱۷ ذی قعد ۱۰۲۰ء ہے اور اس کی مطابقت ابرار عبدالسلام کے مطابق بھی ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء سے ہوتی ہے، دیکھیے:

ابرار عبدالسلام، تاریخِ ادبِ اردو ۱۷۰۰ء تک (تحقیق کے آئینے میں)، (کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۲۷۔۱۲۶۔

(۸) جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اردو، جلد ۱، محولۂ بالا، ص ۴۱۱؛ نیز محی الدین قادری زور، مقدمہ، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، محولۂ بالا، ص ۳۲۲۔

(۹) محمد حسین آزاد، آبِ حیات (مرتبہ ابرار عبدالسلام)، (ملتان: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء) ص ۵۴۔

(۱۰) محی الدین قادری زور، مقدمہ، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، محولۂ بالا، ص ۳۳۳؛ نیز مسعود حسین خان، ہندوستانی ادب کے معمار: محمد قلی قطب شاہ (دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۹ء)، ص ۲۷۔

(۱۱) ملاحظہ کیجیے: کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ (مرتبہ سید محی الدین قادری زور)، (حیدرآباد دکن: مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۹۴۰ء)۔

(۱۲) دیکھیے: کلیات محمد قلی قطب شاہ؛ مرتبہ: سیدہ جعفر، (دہلی: ترقیٔ اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)۔

(۱۳) عرضِ مرتب، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ (مرتبہ محی الدین قادری زور)، محولۂ بالا، ص ۸۔

(۱۴) عبدالقادر سروری، دکنی زبان، مشمولہ اردوے معلیٰ (جلد سوم)، (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، شمارہ ۵۔۴، سنہ ندارد) ص ۸۵؛ نیز دکنی زبان کی دیگر خصوصیات اور صوتیات کے ضمن میں بھی یہ مقالہ مفید ہے۔

(۱۵) رشید حسن خاں، دکنی ادب کے نصاب کی ترتیب سے متعلق چند باتیں، مشمولہ ششماہی فکر و تحقیق، تدریسِ دکنی ادب نمبر (دہلی، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۱۹۸۹ء) ص ۱۶۳۔

(۱۶) سیدہ جعفر، مقدمہ، کلیات محمد قلی قطب شاہ، محولۂ بالا، ص ۲۴۵ وبعدہٗ

(۱۷) مسعود حسین خاں، مقدمۂ تاریخ زبان اردو (لاہور: اردو مرکز، ۱۹۶۶ء)، ص ۲۰۲۔

(۱۸) سیدہ جعفر، مقدمہ، کلیات محمد قلی قطب شاہ، محولۂ بالا، ص ۲۴۵۔۲۴۷

(۱۹) داستانِ زبانِ اردو، اشاعتِ دوم (کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۸۷ء) ص ۶۴۔۶۳۔

(۲۰) مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، محولۂ بالا، ص ۲۰۱۔

(۲۱) (بنگلور: اردو لائبریری سنٹر، ۱۹۷۰ء)، ص ۲۰۔

(۲۲) تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: دکنی زبان کا آغاز و ارتقا (مترجم مولوی غلام رسول)، حیدرآباد: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء)، ص ۴۷۔۴۹

(۲۳) شری رام شرما (مترجم غلام رسول)، محولۂ بالا، ص ۴۷۔

(۲۴) ایضاً، ص ۴۶۔

(۲۵) ایضاً، ص ۴۷۔

(۲۶) ایضاً۔

(۲۷) ایضاً۔

(۲۸) ایضاً۔

(۲۹) ایضاً۔

(۳۰) دیکھیے: دکنی لغت، محولۂ بالا، ص ۲۴۔

(۳۱) بیجاپور دراصل حیدرآباد کے مغرب میں تقریباً پونے چار سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اب بیجاپور کا سرکاری نام وِجے پورہ ہے اور یہ بھارتی ریاست کرناٹک میں شامل ہے۔

(۳۲) دیکھیے حنیف نقوی کا مقالہ: دکنی متون اور قرأت کے مسائل، مشمولہ ششماہی فکر و تحقیق، تدریسِ دکنی ادب نمبر، دہلی، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۱۹۸۹ء، ص ۲۵۔۲؛ نیز اسی شمارے میں شامل حنیف نقوی کا دوسرا مقالہ بعنوان دکنی میں املا و تلفظ کے بعض مسائل (ص ۱۰۳۔۹۶) بھی اہم اور مفید ہے۔

(۳۳) مسعود حسین خاں، ہندوستانی ادب کے معمار: قلی قطب شاہ، محولۂ بالا، ص ۷۱۔۶۵

(۳۴) ایضاً، ص ۷۱۔

(۳۵) ایضاً، ص ۷۲۔۷۱

(۳۶) میر لطف علی عارف ابوالعلائی، فرہنگِ عثمانیہ المعروف بہ اصطلاحاتِ اسنادی (حیدرآباد (دکن): ادارۂ ادبیہ، ۱۹۲۹ء)۔

(۳۷) ابوالمعارف میر لطف علی عارف ابوالعلائی قاضی، دکن کی زبان (ادارۂ ادبیہ: حیدرآباد، ۱۹۳۵ء)۔

(۳۸) ایضاً، ص ۴۔

(۳۹) ایضاً، ص ۴۔۳

(۴۰) سید شعار احمد ہاشمی، دکنی لغت (ناشر، مقام و سنہ ندارد)۔

(۴۱) ایضاً، ص ۳۔۱

(۴۲) ایضاً، ص ۵۔

(۴۳) مالک رام، تذکرۂ ماہ و سال (دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۶۷۔

(۴۴) مسعود حسین خاں و غلام عمر خاں، دکنی اردو کی لغت (حیدرآباد: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۹ء)۔

(۴۵) سید ابو تراب خطائی ضامن، دکھنی لغات (بنگلور: اردو لائبریری سنٹر، ۱۹۷۰ء)۔

(۴۶) امیر عارفی، دکنی فرہنگ (حیدرآباد: ادبی اکیڈمی، ۱۹۷۲ء)۔

(۴۷) جمیل جالبی، قدیم اردو کی لغت (لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء)۔

(۴۸) اشفاق احمد، تعارف، قدیم اردو کی لغت، محولۂ بالا، ص ۴۔

(۴۹) اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد سوم (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۸۱ء)۔

(۵۰) جاوید وشسٹ، بحر المعانی (فرید آباد (ہریانہ)، ناشر مولف، ۱۹۸۷ء)۔

(۵۱) ایضاً، ص ۱۰۔

(۵۲) اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد دوم (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۹ء)۔

(۵۳) آغا حیدر حسن مرزا، دکنی لغت و تذکرۂ مخطوطات (مرتبہ مغنی تبسم) (حیدرآباد: آغا حیدر حسن مرزا ریسرچ سنٹر، ۲۰۰۲ء)۔

(۵۴) مالک رام، تذکرۂ معاصرین (چار جلدیں یک جا)، (راول پنڈی: الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۵۳۔

(۵۵) مالک رام، تذکرۂ معاصرین، محولۂ بالا، ص ۵۳۔

(۵۶) مغنی تبسم، دیباچہ، دکنی لغت و تذکرۂ مخطوطات، محولۂ بالا، ص ۱۳۔

(۵۷) مغنی تبسم، دیباچہ، محولۂ بالا، ص ۱۴۔

(۵۸) ایضاً۔

(۵۹) ایضاً۔

(۶۰) (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۸ء)۔